بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

"تقدیر میں لکھے ہوئے مصائب کے پیش آنے پر حق تعالیٰ جل جلالہ پر اعتراض کرنا موت ہے دین کی، موت ہے توحید کی اور موت ہے توکل و اخلاص کی۔ قضا و قدر پر شکوہ و شکایت ہوئی تو نہ دین باقی رہا نہ توحید قائم رہی نہ توکل رہا اور نہ اخلاص رہا۔ جس دل میں شمع ایمان فروزاں ہو وہ چون و چرا کرنا جانتا ہی نہیں، وہ تو صرف ہاں کہا کرتا ہے۔ مقدر سے جو بھی تکلیف پیش آئی ہو اس پر راضی ہوتا اور دل سے کہتا ہے کہ ہاں ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک مردِ حق آگاہ نے توحید کے مقتضیات ذہن نشین کرتے ہوئے اپنے رفقا سے کہے تھے۔ اِن چند جملوں میں ایمان باللہ کے تقاضوں کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ اللہ پر توکل ایک ایسی سیرت و کردار کی صورت گری کرتا ہے جس کے اگرچہ بے شمار مظاہر ہیں لیکن اس کی نمایاں صفات صبر اور تسلیم و رضا ہیں۔ ایک مومن جب اپنی زندگی کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کی حالت اُس مسافر کی سی ہو جاتی ہے جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہو اور نہ ہی کف بدہن موجیں اُسے ہراساں اور پریشان کرتی ہوں۔ فتح مندیاں اور کامرانیاں جب اس کے قدم چومتی ہیں تو وہ اِتراتا نہیں بلکہ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور اسی طرح جب ناکامیاں اور نامرادیاں اُس کے حصے میں آتی ہیں تو وہ نوشتۂ ایزدی پر برہم ہونے کی بجائے صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور مالک الملک سے دست بدعا ہوتا ہے کہ وہ حالات کا رُخ پھیر دے۔

اگر اس معاملہ کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ صبر یا تسلیم و رضا ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے توکل علی اللہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص اپنے خالق اور مالک کا جس قدر زیادہ معتقد ہوگا، اُسی تناسب سے اُس میں تسلیم و رضا موجود ہوگی۔ صبر وضبط یا تسلیم ورضا اللہ پر توکل کی عملی تعبیر ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں توکل علی اللہ کہلاتی ہے وہی جب انسانی اخلاق میں جلوہ گر ہوتی ہے تو صبر یا تسلیم و رضا نام پاتی ہے۔ یہ صفات انسان کے اندر اُس وقت تک موجود رہیں گی جب تک کہ اُسے اپنے خدا پر یقین اور بھروسہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس چیز پر بے حد زور دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (سورۂ آل عمران - ۲۰۰)

اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (سورۂ بقرہ - ۱۹)

اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں اس حقیقت کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں واضح فرمایا گیا ہے:

عجبا لامرء مومن ان امرہ کلہ لہ خیر ولیس ذالك لاحد الا المومن۔ ان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا وان اصابتہ ضراء صبر فکان خیرا (مسلم)

ایمان دار آدمی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ چیز سوائے اہلِ ایمان کے اور کسی کو میسر نہیں۔ اسے جب خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہے، اور جب اس پر تکلیف یا مصیبت آتی ہے

تو صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام نے صبر و ثبات کو کیوں غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیابی کے مراحل سے گزارنے کے لیے صبر و ضبط ہر حال میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم نے اس صفت سے متصف ہو کر ہی اس دنیا میں فلاح و کامرانی حاصل کی ہے، مگر اسلام میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے، کیونکہ یہاں ایک طرف تو منزل مقصود ایک غیر مرئی ذات کی رضا جوئی ہے اور دوسرے اس ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جو معیارات قائم کیے گئے ہیں وہ بھی ایسے نہیں کہ انہیں حواس کے پیمانوں سے ماپا جاسکے۔ اُن کو وزن کرنے کے لیے ایک دوسری میزان اور دوسرا متقوم ہے اور وہ ان کا دینی نفع اور اُخروی اجر ہے۔ ایک مسلمان جب اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اُس کا رب اللہ ہے اور وہی بلا شرکت غیرے اُس کا خالق، مالک اور فرمانروا ہے تو پھر اسے صادق القول ثابت ہونے کے لیے مختلف آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی اُس پر رزق کے دروازے کشادہ کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ان مادّی وسائل اور اسباب کو اپنا الٰہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کا امین ہے اور انہیں صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہی خرچ کرتا ہے۔ کبھی اُسے تنگی اور مصیبت میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے عمل سے یہ بتاتا ہے کہ یہ دنیاوی مصائب اصل مقصد سے اُسے باز نہیں رکھ سکتے بلکہ مقصد کے ساتھ وابستگی کو اور بڑھاتے ہیں۔ کبھی راستے کی مشکلات خود بخود اُس پر کھول دی جاتی ہیں مگر ایک مسلمان اسے اپنے تدبر اور تفکر کی کرشمہ سازی سمجھنے کے بجائے اسے فضلِ ایزدی سمجھتا ہے اور اگر کبھی مصلحتِ الٰہی اُس کی راہ میں سنگِ گراں حائل کر دیتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تائیدِ ربانی کے بھروسے ان پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے۔ غرض مختلف طریقوں سے خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور خدا کے یہ فرمانبردار بندے اُس کے فضل کے سہارے زندگی کی اُن پرپیچ راہوں میں ثابت قدم رہ کر اپنی متاعِ ایمان کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ آزمائش

ایمان کی ایک لازمی اور ضروری شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط (آل عمران - ۱۸۰)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔

الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ (عنکبوت ۱-۳)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (توبہ - ۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیئے جاؤگے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی وجہد کا حق ادا کیا۔ اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ایک مسلمان جب اس دنیا کے مصائب وشدائد سے گزارا جاتا ہے تو اس عمل کا مقصد اُسے مفلوج یا برباد کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کی حقیقی غرض یہ ہوتی ہے کہ اُسے نہ صرف ہر قسم کے کھوٹ اور آلائش سے پاک کر کے کندن بنا دیا جائے بلکہ اُسے ایک ایسا موقع بھی فراہم کیا جائے جس میں وہ اپنے آپ کو ایمان میں سچا اور کھرا ثابت کر سکے۔

ایک شریر اور مفسد انسان کسی وقتی جذبے کے زیرِ اثر آ کر کبھی کبھار ایک نیک سے نیک کام

سرانجام دے سکتا ہے، اور اسی طرح ایک شریف سے شریف انسان کسی ہنگامی جوش کے تحت ایک بدترین فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکال سکتے کہ ان دونوں کی زندگیوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ برا آدمی اس لیے نیک نہیں کہلا سکتا کہ اُس نے زندگی میں کوئی ایک آدھ اچھا کام کر دیا ہے اور ایک نیک آدمی کبھی اس بنا پر بُرا نہیں کہلا سکتا کہ اُس سے نادانستہ طور پر ایک غلطی کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی شخص کے نیک یا بد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کا انحصار ایک آدھ فعل پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اندازِ زیست یا اسلوبِ حیات کو بحیثیتِ مجموعی دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ یہی چیز زندگی کا رخ متعین کرتی ہے۔ زندگی میں افعال و اعمال اگرچہ بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم زندگی کی عام ڈگر ہے۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کوئی نیک کام سرانجام دے لینا نہایت سہل اور آسان ہے لیکن پوری زندگی کو پاکبازانہ گزارنا بہت دشوار منزل ہے۔

اصل چیز نیک عمل نہیں بلکہ نیک روش ہے۔ عمل تو اس روش کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے لہٰذا نیک اور بد زندگی کے درمیان حدِ فاصل کسی ایک عمل کے ذریعہ نہیں کھینچی جا سکتی بلکہ ان کے درمیان جو چیز نشانِ امتیاز ہے وہ صرف اندازِ زیست ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندازِ زیست مختلف اعمال کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن اس میں افعال و اعمال کے علاوہ کسی فرد یا قوم کا نظریہ بھی شامل ہوتا ہے جس کی حیثیت سیمنٹ کی سی ہوتی ہے اور وہ انسان کے مختلف اعمال کو باہم ایک دوسرے سے پیوست کر کے سیرت و کردار کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرتا ہے۔ فکر و عمل کے باہمی امتزاج سے اٹھائی ہوئی کیرکٹر کی اس ٹھوس عمارت میں کسی ایک فعل یا عمل کے مقابلے میں زیادہ پائیداری اور مضبوطی پائی جاتی ہے۔ پھر ایسے تمام افعال جو کسی نظریۂ زندگی کے طفیل معرضِ وجود میں آئے ہوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتے ہیں اور اس طرح زندگی میں ایک فطری وحدت نمودار ہوتی ہے جس فرد کی زندگی کے مختلف مظاہر میں ہم رنگی پائی جائے اُس کے بارے میں سمجھ لیجیے کہ وہ

ایک خاص طرزِ فکر کا حامل ہے یا سادہ الفاظ میں وہ اپنا ایک مقصد یا ایمان رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی کبھی مرغ باد نما نہیں بن سکتی جس کے رُخ کو مادی حوادث کے تند و تیز جھونکے ہر لمحہ بدلتے رہیں۔ اس کی حیات ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو دنیا کے ہر رہرو کو منزلِ مقصود کا پتہ دیتا ہے۔

ایک زندہ و پائندہ خدا پر ایمان لانے والے سے بڑھ کر آخر کس شخص کی زندگی میں پائیداری اور استواری ہو سکتی ہے۔ اور ایک مومن سے بڑھ کر کون شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کی زندگی میں وحدت اور یکسانیت ہو۔ جو شخص اللہ پر ایمان لانے کا دعویدار ہے وہ درحقیقت اپنے دل و جان سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اُس کی زندگی کی غایتِ اولیٰ اپنے مالک کی رضا جوئی ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے وہ جیتا ہے، تگ و دو کرتا ہے، مصائب برداشت کرتا ہے اور بالآخر اپنی جان، جانِ آفرین کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اگرچہ زندگی کے مختلف منازل سے گزرتا ہے لیکن ان سب میں اُس کے سامنے مقصد صرف یہی ایک رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان کے نزدیک دُکھ اور سکھ، مسرت اور غم، کامیابی و ناکامی سب اعتباری باتیں ہیں۔ ایک مسلمان اُس وقت تک کامیاب ہے جب تک اُسے اپنے مقصد کے ساتھ عشق اور وابستگی ہے اور وہ اس وقت ناکام ہے جب اُس کی منزلِ مقصود اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اس بنا پر ایک مسلمان کی کامیابی اور ناکامی خارجی پیمانوں سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کو معلوم کرنے کے لیے اُس کے اپنے سینے ہی میں ایک پیمانہ لگا دیا گیا ہے جسے عام اصطلاح میں دل، قلب یا وجدان کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ سلطنتوں کی سلطنتیں فتح کرتا چلا جائے۔ مگر اللہ کے نزدیک اُن کے یہ سارے کارنامے اس وجہ سے بے وزن ہو کر رہ جائیں کہ ان کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق نہ تھا بلکہ کشور کشائی اور حصولِ اقتدار تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ایک انچ بھر زمین حاصل نہ کر سکے مگر وہ اللہ کے ہاں محبوب ہو کیونکہ اس کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی تھا اور اس کے لیے سعی کرنے کا حق اُس نے ادا کر دیا۔ یہاں اصل چیز مقصد اور اخلاص ہے۔ اور یہی دو چیزیں اندازِ زیست کی تشکیل کرتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک چیز کی وضاحت نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم زندگی میں یکسانیت اور صبر و ثبات کا جو بار بار ذکر کر رہے ہیں تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مسرت اور غم، فتح مندی اور ناکامی کے سارے جذبات اور احساسات سے ہمیں یکسر محروم کر کے ہمارے اندر یونانی فلاسفہ کی سی روایتی (ا) بے پروائی کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ اسلام کا مقصد ہمیں بے حس بنانا نہیں بلکہ اُس کی غرض یہ ہے کہ کامرانی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یا ناکامی کی چوٹیں سہتے ہوئے بھی ہم اپنے خالق اور مالک کو بھولنے نہ پائیں۔ اگر ہم سے ہمارے جذبات و احساسات ہی سلب کر لیے جائیں تو پھر تو اسلام کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسلام ہم سے ہماری انسانیت اور آدمیت چھیننے نہیں آیا بلکہ ہمیں یہ سکھانے آیا ہے کہ ہم زندگی کی مختلف کیفیات سے گذرتے ہوئے اپنے خالق سے اپنا تعلق منقطع نہ کرنے پائیں۔ قرآن پاک اور احادیثِ نبوی میں اکثر مقامات پر اس امر کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر مصائب کے ہجوم میں گھر کر مضطرب اور پریشان ہونا بالکل فطری امر ہے اور اس سے انبیا تک متاثر ہوئے ہیں:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔

(البقرہ ۔ ۲۶)

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی؟ اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ آیت اس امر کا صاف اظہار کر رہی ہے کہ حوصلہ شکن حالات میں پریشان ہو جانا بالکل ایک فطری چیز ہے۔ اسی طرح احادیث میں اُس سب سے زیادہ ضبط اور صبر کرنے والی ذاتِ اقدس کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی آنکھوں سے بھی کبھی کبھی غم انگیز منظر دیکھ کر آنسو بہہ جایا کرتے تھے۔

وعن ابی زید اسامة بن زید بن حارثة مولی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

حضرت اُسامہ بن زید بن حارثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے محبوب اور محبوب

وحبه وابن حبه رضی الله عنه قال ارسلت
بنت النبی صلی الله علیه وسلم ان ابنی قد
احتضر فاشهدنا فارسل یقرئ السلام و
یقول: ان لله ما اخذ وله ما اعطی وکل شیئ
عنده باجل مسمی، فلتصبر ولتحتسب،
فارسلت الیه تقسم علیه لیاتینها فقام و
معه سعد بن عبادة ومعاذ بن جبل وأبی بن
کعب وزید بن ثابت ورجال رضی الله عنهم
فرفع الی رسول الله صلی الله علیه وسلم الصبی
فاقعده فی حجره ونفسه تقعقع، ففاضت عیناه
فقال سعد یا رسول الله ما هذا؟ فقال هذه
رحمة جعلها الله تعالی فی قلوب عباده۔
(بخاری، مسلم)

کے بیٹے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا قریبِ مرگ ہے آپ تشریف لے آئیے، آپ نے سلام کہلا بھیجا اور فرمایا اللہ ہی کے لیے ہے جو اس نے لیا اور جو اس نے دیا اور ہر چیز کا اس کے پاس ایک وقت مقرر ہے، صبر کرو اور اجر طلب کرو۔ انہوں نے پھر کہلا بھیجا کہ آپ جلدی تشریف لائیے، یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور آپ کے ساتھ سعد بن عبادہؓ، معاذ بن جبل، اُبَیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت اور بہت سے لوگ تھے۔ آپ کے پاس بچہ اٹھا کر لایا گیا آپ نے اسے گود میں لے لیا اور اس وقت وہ دم توڑ رہا تھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔

قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویؐ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں صبر سے مراد جذبات و احساسات کی محرومی نہیں بلکہ اسلامی اصطلاح میں اس کے معنی پامردی، دل کی مضبوطی اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اسلام ہمیں بے حس چٹان بنانا نہیں چاہتا بلکہ ہمیں ایک صاحبِ دل انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنے پہلو میں دل کی جگہ پتھر باندھ لیں اور اپنی حس کو اس حد تک مردہ کر لیں کہ مسرت و غم کی مختلف کیفیات ہم پر بالکل اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اسلام ہمارے سارے احساسات کو زندہ رکھنے کا سامان کرتا ہے، ہمارے قلب کو تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ بنانے کا آرزومند ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویؐ میں جو دعائیں موجود ہیں اگر آپ انہیں اس

غور نظر سے مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دینِ حق انسان کے جذبات اور احساسات کو کس خوبی سے جلا دیتا ہے۔ یہاں کسی تفصیل کا موقع نہیں۔ ہم یہاں صرف چند دعائیں درج کرتے ہیں جن سے اس چیز کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ)

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں اگر کوئی قصور ہو جائے، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ممتحنہ)

اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے اور ہم سے درگزر فرما۔ اے رب ہمارے تو ہی زبردست اور حکیم ہے۔

اللّٰھم انی اعوذ بك من العجز والکسل والجبن والھرم والمغرم والمأثم ومن عذاب النار وفتنة النار وفتنة القبر وعذاب القبر وشر فتنة الغنا وشر فتنة الفقر ومن شر فتنة المسیح الدجال ومن فتنة المحیا والممات ومن القسوة والغفلة والعیلة والذلة والمسکنة والکفر والفسوق والشقاق والسمعة والریاء ومن الصمم والبکم والجنون والجذام وسیئ الاسقام وضلع الدین ومن الھم والحزن والبخل وغلبة الرجال واعوذ بك

اے میرے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں پست ہمتی اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے سے، قرض داری اور گناہ گاری سے، دوزخ کے عذاب اور آگ کے فتنے سے، قبر کے فتنے اور قبر کے عذاب سے، مال و زر اور محتاجی کے بدترین فتنوں سے، مسیح دجال کے برے فتنے اور زندگی و موت کی آزمائشوں سے، سنگدلی اور غفلت اور تنگدستی اور ذلت و خواری سے، کفر اور فسق سے اور جھگڑالو پن اور شہرت پسندی اور ریاکاری سے، بہرے اور گونگے پن سے، جنون اور جذام اور بری بیماریوں سے، بارِ قرض اور فکر و غم سے، بخل اور لوگوں کے غلبہ سے، اور اس سے کہ ناکارہ عمر

من علم لا ینفع ومن نفس لا تشبع ومن دعوۃ لا یستجاب لھا۔

تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے اور اُس علم سے جو نافع نہ ہو اور اُس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اُس نفس سے جو سیر نہ ہو اور اُس دُعا سے جو قبول نہ ہو۔

ان دعائیہ کلمات کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں جذبات و احساسات کی کس قدر حرارت موجود ہے۔ کیا یہ واردات کسی ایسے دل کی پیداوار ہیں جو مر گیا ہو یا یہ ایک ایسے قلب کی تخلیق ہیں جن میں زندگی کی صحت اور توانائی موجود ہے احساس مجبوری جو ان کلمات کی جان ہے کسی شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ عمل کا زبردست محرک ہے۔ اس کی بدولت انسان کا خدا کے ساتھ رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

آئیے اب ایک نگاہ ذرا اُن مراحل پر بھی ڈال لیں جہاں صبر ہی بہترین زادِ راہ ہے۔

ایک انسان جو دعوتِ حق کے پاک اور مقدس عزم کے ساتھ اٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ حق جس پر اس کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے اور جس کی گواہی دنیا کی ہر چیز دے رہی ہے، وہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ اجنبی چیز ہے۔ انسانوں کی اکثریت اس نام کو سن کر چونکتی ہے، اس سے برأت ہوتی ہے، اس کی آواز پر کان بند کر لیتی ہے۔ یہ چیز ایک داعی کے لیے بڑی ہی پریشان کن ہوتی ہے

پھر اس مخالفت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ معاملہ صرف تغافل اور بے حسی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اسی حق کے خلاف جو درحقیقت اُن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی میراث ہوتی ہے، لوگ ایک محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ اسے دبانے کے لیے طرح طرح کے منصوبے تیار کیے جاتے ہیں، اس کو بلند کرنے والوں پر کبھی آرے چلائے جاتے ہیں، کبھی انہیں صلیب دی جاتی ہے، کبھی انہیں اپنے وطن سے نکالا جاتا ہے کبھی انہیں قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے اور کبھی انہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا ہے۔ الغرض اُن پر

خدا کی زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔

ایک طرف نوعِ انسانی کے ہاتھوں اُن کا یہ حشر ہوتا ہے اور دوسری طرف ذات باری تعالیٰ اُن کی آزمائش شروع کر دیتی ہے۔ وہ کچھ مدت انتظار کر کے دیکھتی ہے کہ کون اپنے دعوے میں پختہ اور قول میں سچا اور کھرا ہے۔ ان حالات میں جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بے بسی سامنے موجود ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورشیں اور ہنگامہ آرائیاں ہجوم کر رہی ہوں، انسان کا گھبرا اٹھنا ایک فطری امر ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (طور-۲) — (اور اے رسول) صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کر، تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (یونس-۱۱) — اور صبر کر یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے۔ وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود ۴) — صبر کر، یقیناً انجام کار پرہیز گاروں ہی کے حق میں ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (روم-۶) — پس صبر کر، بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (دھر-۲) — صبر کے ساتھ اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر، اور ان (مخالفین) میں سے کسی گنہگار ناشکرے کا کہا نہ مان۔

اس مضمون کو ایک حدیث میں ابو عبداللہ خباب بن الارت کی روایت سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضور سرورِ کائنات ایک چادر سے ٹیک لگائے خانہ کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ آپ ہمارے لیے مدد کیوں نہیں مانگتے؟ آپ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

قد کان قبلکم یوخذ الرجل فیحفر له فی الارض فیجعل فیها ثم یوتی بالمنشار — اگلی امتوں میں یہ کچھ گزر چکا ہے کہ ایک آدمی پکڑ لیا جاتا پھر اُس کے لیے گڑھا کھودا جاتا اور اسے گڑھے میں

فیوضع علی راسہ فیجعل نصفین ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمہ وعظمہ مایصدہ ذالک عن دینہ، واللہ لیتمن اللہ ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الا اللہ والذئب علی غنمہ ولکنکم تستعجلون۔

رکھ کر آرہ اس کے سر پر چلایا جاتا یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور لوہے کی کنگھی آدمی کے سر پر پھیری جاتی اور وہ ہڈی اور گوشت میں دھنستی ہوئی پار ہو جاتی۔ مگر یہ تکلیفات ان لوگوں کو راہ حق سے نہ ہٹا سکیں خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اس کام کو یقیناً پایہ تکمیل تک پہنچائیگا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اللہ کے سوا کسی کا اسے خوف ہوگا ہاں بھیڑیے کا اس کو اپنی بکریوں کیلیے خطرہ ہو سکتا ہے لیکن تم جلد بازی سے کام لیتے ہو۔

صبر کے معنی صرف یہی نہیں کہ آدمی مصائب کو برداشت کرے اور بیقرار نہ ہو، بلکہ اس میں تسلیم و رضا کا عنصر بھی شامل ہے۔ ایک داعیٔ حق کا فرض ہے کہ اس دعوت کی راہ میں جو مصیبتیں اور مشکلات آئیں انہیں خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرے اور یہ یقین رکھے کہ جب اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے گا تو وہ ان تکلیفات کو خود بخود دور کر دیگا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصائب کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ برداشت کیا اس کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ ۔ (ص ۴۴)

ہم نے بلاشبہ ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ تھا، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا۔

اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لخت جگر، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مطالبہ خداوندی کا ذکر کیا تو انہوں نے حکم الٰہی پر پوری تسلیم و رضا کا اظہار کیا اور فرمایا:

یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ

ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کر ڈالیے

اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صافات ۳۰) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اسی تسلیم و رضا کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

وامر بالمعروف وانہ عن المنکر و نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت تجھ پیش آئے

اصبر علی ما اصابك ان ذالك من عزم الامور اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

مصائب کے پیش آنے پر تسلیم و رضا کے طرزِ عمل کا ایک ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر کی یہی کیفیت تو درحقیقت ایمان باللہ کی جان ہے۔ یہی چیز ایک خدا پرست کو مادہ پرست سے ممیز کرتی ہے۔ مادہ پرست انسان کے فکر کا زاویہ چونکہ مادہ کے محور پر گھومتا ہے اس لیے وہ زندگی کے سارے مصائب کی علتِ غائی صرف مادی حالات کی ناموافقت کو قرار دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تکلیفات نے اگر اُسے گھیرا ہے تو اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ حواس کی دنیا اور اس کے مال و اسباب کو اپنے لیے کارآمد بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ زندگی کے شدائد و مصائب میں ایک گہری حکمت و دانائی دیکھتا ہے۔ وہ ان سے عبرت پکڑتا ہے۔ اُس کے نزدیک مسرت و غم، آرزوؤں کی کشمکش، انسانیت کی کامرانیاں اور حسرتیں، قوموں کے عروج و زوال مادی حوادث کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ یہ سب اللہ کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک زبردست مدبر کی تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ان خارجی حوادث کے پس پردہ جھانک کر اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے جس کے دراصل یہ سارے مظاہر ہیں اور پھر اپنے آپ کو بالکل رضاکارانہ طور پر اس حقیقت کے تابع کر دیتا ہے۔ یہی معراجِ انسانیت اور کمالِ آدمیت ہے۔ یہی چیز ایک مومن کے قلب کو طمانیت کے نور سے بھر دیتی ہے۔ اس کے ذہن کو آفاقیت، نگاہوں کو بلندی اور علم کو وسعت عطا کرتی ہے۔ یہی مقام ہے جس پر پہنچ کر ایک انسان پٹ کر ہنستا ہے، گر کر سنبھلتا ہے اور مصائب کے ہجوم میں گھر کر بھی اپنے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ یہ اسی ایمان کا اعجاز تھا کہ عین اُس حالت میں جب کہ ابو فکیہہ کو پیٹ پیٹ کر مختل الحواس کر دیا گیا تھا تو اُن سے ایک گزرتے ہوئے گبریلے کے بارے میں استہزاءً کہا گیا کیا تیرا پروردگار یہی تو نہیں؟ تو انہوں نے بلا تامل فرمایا: میرا اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

صبر کے معاملے میں ایک اور ضروری چیز تحمل اور بُردباری ہے۔ آدمی جب تبلیغ دعوت کا کام کرتا ہے

تو اسے مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان میں ایک مختصر تعداد اُن سلیم الفطرت لوگوں کی ہوتی ہے جو حق کی آواز کو سنتے ہی اُس پر اس طرح لبیک کہتے ہیں گویا کہ وہ پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ ان کے معاملے میں تو ایک داعی کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی بلکہ وہ ہمیشہ السابقون الاولون ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تعداد میں ہمیشہ کم ہی رہے ہیں۔ ایک اچھی خاصی تعداد اُن لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نیتیں خواہ ٹھیک ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات کے لاتعداد کانٹے چبھے ہوتے ہیں۔ ان کانٹوں کو نکالنا بڑی دیدہ ریزی، محنت اور حکمت چاہتا ہے۔ اس میں انتہائی صبر و ضبط اور ہمدردی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ اس راہ میں ایسے لوگوں سے بھی بالکل ناگزیر طور پر سامنا ہوتا ہے جو اپنے مزاج کے لحاظ سے بڑے ہٹ دھرم اور ضدی ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بسا اوقات ایسی نفرت انگیز حرکات کا ارتکاب کر دیتے ہیں کہ اگر صبر و ضبط کی زبردست مشق نہ ہو تو آدمی جادہ مستقیم سے ہٹ جائے۔ یہ کمینہ خصلت لوگ نت نئی بیہودگیاں سوچتے ہیں اور ہر روز اوچھے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حق کے علمبرداروں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے قصوروں کو معاف کر دیں اور ان کی بیہودگیوں کے مقابلے میں اخلاقی پامردی دکھلائیں۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ - وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (نحل - ۱۶)

اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر و برداشت کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں لیکن خدا کی مدد سے، اور اُن کا غم نہ کر اور نہ انکی سازشوں سے دل گرفتہ ہو

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (فصلت - ۵)

بھلائی اور برائی برابر نہیں ہیں۔ برائی کا جواب اچھائی سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی وہ قریبی دوست ہو جائے گا مگر یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہوتا ہے۔

اسی مضمون کی حدیث نبوی میں اس طرح صراحت کی گئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الشدید بالصرعۃ انما الشدید من یملک نفسہ عند الغضب۔ (صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے جو حریف کو میدان میں پچھاڑ دے۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے

ایک دوسری حدیث میں صبر کی ایک نہایت ہی جامع و مانع تعریف ملتی ہے اور اسے ایمانی اخلاق کی خشتِ اول قرار دیا گیا ہے:۔

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلث من اخلاق الایمان من اذا غضب لم یدخلہ غضبہ فی باطل ومن اذا رضی لم یخرجہ رضاہ من حق ومن اذا قدر لم یتعاط مالیس لہٗ۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تین باتیں ایمانی اخلاق میں سے ہیں۔ جب غصہ آئے تو انسان مغلوب الغضب ہو کر باطل کی سرحد میں نہ گھس جائے، جب کسی سے خوش ہو تو یہ خوشی اسے حق کے حدود سے نہ نکال لے جائے، اور جب آدمی قدرت و اقتدار پائے تو وہ کام نہ کرنے لگے جس کا اسے حق نہیں ہے

یہ وہ مقام ہے جس پر ایک مسلمان کے صبر اور توکل کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ اپنے فکر و عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ اُس کا تعلق ہنگامی اور عارضی نہیں بلکہ نہایت پختہ اور پائیدار ہے۔ اور اسی مقام محمود کو حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بڑے زوردار الفاظ میں یہ بشارت دیتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ (حم السجدہ ع ۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے اُترتے ہیں (اور اُن سے فرمایا جاتا ہے) کہ تم نہ خوفزدہ ہو اور نہ غمگین اور اُس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ہم تمہارے اس دنیا کی عارضی زندگی میں بھی دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو تمہارے نفس چاہیں اور تمہارے لیے اس میں ہی جو تم مانگتے ہو بخشش والے رحمت والے کی طرف سے میزبانی کے طور پر